مقدّس جھوٹ
راجندر سنگھ بیدی
مکتبہ پیام تعلیم۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔۲۵

مقدس جھوٹ

راجندر سنگھ بیدی

مکتبہ پیامِ تعلیم۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی

ان دِنوں ہم جہانگیر آباد میں رہا کرتے تھے۔ وہاں ہمارا پرانا مگر بہت بڑا مکان تھا، جسے ہم "پرتھوی بل" کہا کرتے تھے۔ پرتھوی بل زمین کی طاقت ہر جگہ ایک ہی سی ہوتی ہے، مگر شہروں کی مٹّی میں ہمیں وہ طاقت نہیں ملتی، جو پرتھوی بل میں ملتی تھی۔ وہاں کی مٹّی میں کوئی اور ہی خوبی تھی، کوئی اور ہی بات تھی۔

قدرت کی ہر اچھی چیز ہمیں پرتھوی بل کے قریب مل جاتی تھی۔ ابھی ہمیں کراؤندے کا خیال آیا، باہر آکر دیکھا تو دتاراج کراؤندے اور سنگھاڑے بیچنے آ گیا۔ اگر آڑو اور کمرخ کے بارے میں سوچا تو وہ بھی باہر موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہماری سوچ صِرف کھٹّے میٹھے پھلوں اور سستے قسم کے کھلونوں تک ہی محدود ہو، مگر پھر بھی سب کچھ ہمارے پاس خود بخود کھنچا چلا آتا تھا۔

ہمارے گھر کے قریب ہی ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی، جس کے دونوں کناروں پر جنگل تھا۔ ہماری کہانیوں کے جن، بھُوت، دیو اور پریاں سب اس چھوٹے سے جنگل میں رہتے تھے۔

ہماری نظریں ہمیشہ اس جنگل میں الجھ کر رہ جاتیں اور جس طرح گھِر گھِر آنے والے بادلوں میں بچّے کو اپنی من پسند تصویر مل جاتی ہے، اسی طرح اس جنگل کے درختوں کی ہر ٹہنی اور ہر پتّہ ہمارے دل کی کہانی بن جاتا۔ جب ہم پر تھوی بل کے کھلے صحن میں کبڈی، بارہ گوٹی، اور کوڑا جمال شاہی کھیلتے کھیلتے اُکتا جاتے اور دماغ کوئی نیا کھیل تجویز کرنے سے معذور ہو جاتا تو ہم ندی میں نہانے کے لیے چلے جاتے، چاہے وہاں جانا ہمارے لیے منع تھا، مگر تمام منع کی گئی چیزوں کو آزمانا، مثال کے طور پر سلائی کی مشین کی ہتھی کو گھمانا، عشق پیچاں کی بیل کو قینچی سے کاٹنا، ہمارا سب سے پسندیدہ شغل تھا۔

کسی نے کہا ہے کہ چھے سال کی عمر کے بچّوں کا جسم خاص خوراک اور دل تجربے سے بڑا ہوتا ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ نصیحت ان کے لیے بے کار ہوتی ہے۔ ان کے ذہن کے کسی گوشے میں ایک بھبھوکا سے اُڑ جانے والا جذباتی مادہ ہوتا ہے جس کو

سدھارنے کے لیے ان کو چھو دینے سے ان کا تصوّر ایک نیا رنگ، ایک نئی حد، یا پھر دونوں چیزیں پیدا کر لیتا ہے۔ ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کے سیلاب اُمنڈ آتے ہیں۔ ان کے خوابوں کے رنگ کبھی نہ مٹنے والے نشان بن جاتے ہیں۔

میں اپنے خاندان میں سب سے چھوٹا تھا۔ جب میں ابھی چھ سال کا تھا تو اس وقت میرے باپ کی عمر پچاس برس کے لگ بھگ تھی۔

میرے باپ کو نزلے کی بہت پرانی بیماری تھی، اس لیے وہ کچھ گنگنا کر بولتے تھے۔ ان کا دماغ آسانی سے خوشبو اور بدبُو میں فرق محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی میرے باپ کی باتوں پر لوگ منہ دوسری طرف کر کے ہنس دیتے تھے۔ میں ہنستا بھی تھا اور افسوس بھی کرتا تھا۔ دماغ میں خوشبو اور بدبُو نہ سمانے پر کئی بار خود ان کو بھی اپنے اوپر رحم آجاتا تھا۔ نزلے کی وجہ سے ان کے سر اور داڑھی کے بال برف کی طرح سفید ہو گئے تھے۔ حالانکہ جسمانی طور پر میرے باپ کافی صحت مند تھے۔

ہمارے گاؤں والے اپنے بچے کا نام رکھوانے کے لیے میرے باپ کے پاس آیا کرتے تھے۔ میرے باپ بچے کا نام عمر دین، خیر دین، نانک چند اور فاطمہ وغیرہ

رکھ دیتے، اور لوگ ان ناموں کو پسندیدگی سے قبول کر لیتے تھے۔ یہ نام عام طور پر بیساکھی کے روز رکھا جاتا اور شیرینی تقسیم ہوتی۔

بیساکھی کی ہوا جو گندم سے خوشوں کو الگ کر دیتی ہے ان کی نرم، خُوب صورت اور دودھ ایسی سفید ڈاڑھی کو دو حصّوں میں تقسیم کر کے اُن کے دونوں شانوں پر پھینک دیتی۔ اور یہ چیز ہمارے دلوں میں ایک طرح کی ٹھنڈک، اور تقدس پیدا کر دیتی۔

میرے باپ خاندان کے تمام بچّوں کو اکٹھا کر لیا کرتے اور ان کے شور سے بچنے کے لیے اُنہیں کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ان کی کہانی عام طور پر ان کی اپنی ہی زندگی کے کسی واقعہ سے متعلّق ہوتی تھی اور اس میں نصیحت کا پہلو ضرور ہوتا تھا۔ کہانی عام طور پر یوں شروع ہوتی تھی:

''جب میں چھوٹا سا تھا''!

میرے ذہن میں بہت سے ماں باپ اور دوسرے بہت سے بزرگ اپنے بچّوں کو کہانی سناتے ہوئے اسی طرح اجاگر ہوتے ہیں۔ جب میں چھوٹا سا تھا یا جب میں

چھوٹی سی تھی اور آخر میں یہ ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ شروع ہی سے بڑے دور اندیش اور سچّائی کے پتلے ہوتے تھے۔ اُنہوں نے شرم و حیا کو کبھی اپنے ہاتھوں سے نہیں جانے دیا تھا۔ اُنہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا، اور یہ کہ بڑوں کے ساتھ کبھی گستاخی سے پیش نہیں آئے تھے۔

اسی قسم کی باتیں سُن سُن کر میرا دل بھی یہی چاہتا کہ میں بھی اُن ہی کی طرح نیک بن جاؤں۔ یہ میری ایک تمنّا تھی۔ مجھے اپنا باپ ایک بہت ہی بڑی ہستی دکھائی دیتے تھے۔

جہانگیر آباد کے تمام لوگ ان کے آگے عزّت اور احترام سے سر نیچا کر لیتے تھے اور بڑے بابا کے سوا کسی اور نام سے نہیں پکارتے تھے۔ گاؤں کے سب لوگ ان سے بہت محبّت کرتے تھے۔

مجھے اس بات پر فخر تھا کہ وہ میرے باپ نہیں اس لیے کہ وہ اپنے بڑے پن کی وجہ سے قصبے کے تمام لوگوں کے باپ تھے۔

ایک بزرگ تھے ہر کوئی اُن کی بہت عزّت کرتا تھا۔

مجھے بس یہیں تک یاد ہے کہ میرے باپ نے باپ کی محبت کا روپ دھار لیا تھا۔ گاؤں کے کسی بچّے کے قریب آتے ہی ان کا دایاں ہاتھ خود بخود پیار کے لیے اُٹھ جاتا۔ یہ کتنا بڑا ظلم تھا کہ اس عام باپ والے طریقہ میں پہلے جان بوجھ کر اور پھر ایک عادت کے طور پر اُنہوں نے اپنے بہت سے قدرتی جذبات و خیالات کو کچل دیا تھا۔

ان کے بچپن کی ایک کہانی ہم سب کو بہت پسند تھی۔ ہم بہت سے بچّے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے پر تھوی بل کے کھلے صحن میں بیٹھ جاتے اور اپنے بزرگ کی ایک ہی کہانی، ان کی زندگی کا سب سے بڑا واقعہ بار بار دہراتے تھے۔

ایک بات بہت ضروری تھی۔ اور وہ یہ کہ اگر بچّہ کہانی سُنائے تو اسی طرح آنکھیں مٹکا کر اور چٹکی بجا کر سنائے۔

میرے باپ کی یہ کہانی تمام بچّوں کو اسکول کے پہاڑوں کی طرح یاد تھی اور باسی روٹی کی طرح مزہ دیتی تھی۔ اگر میں اس کہانی کا ایک لفظ بھی بدلنے کی کوشش کرتا تو دوسرے بچّوں کی نظروں میں کوئی بہت بڑا جُرم کر دیا تھا۔ ایسے موقع پر

میرے چچیرے بھائی بہن مجھ سے ناراض ہو کر اُٹھ کھڑے ہوتے۔

وہ کہانی چوہوں کے متعلّق تھی اور ایک طرح سے ہمارے خاندان میں ایک گیت بن چکی تھی۔

یہ کہانی اس طرح تھی:

جب بابا (میرے باپ) اور میرے چچا دیوا چھوٹے سے تھے تو ان کو ایک بار چوہے پکڑنے کی سوجھی۔ ان دِنوں یہاں اس بڑے سے دیو نما پر تھوی بل کی جگہ ایک چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا مکان ہوا کرتا تھا، جس میں ہر طرف چوہوں کے بڑے بڑے بِل تھے۔ چوہے ہر روز پنیر کی ٹِکیاں اور بابا کی مزے دار باسی روٹیاں اُٹھا کر لے جاتے تھے۔ ایک دِن چاچے دیوے نے ایک بڑا سا پنجرہ لگایا۔ سارے چوہے اس پنجرے میں پھنس گئے، مگر ایک چوہا بھاگ گیا اور ایک سُرنگ میں گھُس گیا۔ اب تمھیں یہ جاننا چاہیے کہ بچّے اس موقع پر بڑے خوفزدہ ہو جاتے۔ سُرنگ ایک بہت لمبا چوڑا بِل ہوتا ہے جس میں سے گُزر کر چوہے جنگل میں اور پھر اپنے مکان میں آجاتے تھے۔ میرے بابا نے اس سُرنگ کے منہ پر ایک پنجرہ رکھ دیا اور اس کو شہتوت، کراؤندے اور توریوں کے گچھے اور بیے

کے گھونسلے سے ڈھک دیا۔

آنے والی صُبح کو چاچا دیوے کی ہمّت نہ ہوئی کہ وہ پنجرے کے پاس جائے، اس لیے بابا اکیلے ہی گئے۔ اکیلے (ادھر آتے ہوئے) بابا اس وقت چھوٹا سا بچّہ تھے۔

اُنھوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ پنجرے پر سے پتّے ہٹائے تو دیکھا کہ اس میں ایک موٹا سا چوہا تھا۔ یہ چوہا بھورے رنگ کا پورے قد کا تھا۔ مٹکتا ہوا اور لٹکتا ہوا، لٹکتا ہوا اور مٹکتا ہوا۔

بابا اس قدر گھبرائے، اس قدر گھبرائے کہ بھاگتے ہوئے جوتوں سمیت چوکے میں گھُس گئے۔ (ہمارے لیے کہانی کا یہ حصّہ سب سے زیادہ حیرانی پیدا کرنے والا تھا) جوتے سمیت بھاگتے ہوئے چوکے میں گھُس گئے۔

وہ بھاگتے ہوئے آئے اور چاچا دیوے کو زور زور آوازیں دینے لگے:

”دیوے۔۔۔۔۔۔۔ او دیوے۔۔۔۔۔۔۔۔“

آوازیں دیتے دیتے اُنھوں نے اپنے دونوں ہاتھ منہ کے دونوں طرف رکھ لیے تھے تاکہ آواز اِدھر اُدھر کھنڈنے کی بجائے اکٹھی ہو کر چاچا دیوے تک پہنچ

جائے۔ پھر میرے بابا اس قدر زور سے پکارے کہ اُن کی آواز ایک چیخ میں بدل گئی اور پھر چیخ نے کھانسی کا روپ دھار لیا۔ ”کھوں۔۔۔۔ کھوں۔۔۔ کھوں!“ پھر بابا نے چوہے کو مار دیا۔ بالکل مار دیا، اور جہانگیر آباد کے جمعدار سے اُس کی کھال اُتروا کے اسے چھت پر رکھ دیا۔

دو تین روز کے بعد جب کھال سوکھ گئی تو میرے بابا نے اسے پھگو جمعدار کے ہاتھ بیچ دیا۔ پھگو نے اُسے کسی اور کے ہاتھ بیچ دیا اور اس نے آگے کسی اور کے ہاتھ۔۔۔۔ اور پھر ایک آدمی نے اس کی فَر بنا دی۔ آج کل بڑی بھابی کے سویٹر پر وہی فَر لگی ہوئی ہے۔

اس موقع پر بات ناقابلِ برداشت ہو جاتی اور تمام بچّے شور مچانا شروع کر دیتے:

”جھوٹ۔۔۔۔ جھوٹ۔۔۔۔۔۔“!

”بالکل جھوٹ۔۔۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔۔ اتنی موڈی جرنیل بھابی کے اتنے خوب صورت سوئیٹر پر ایک چوہے کی فَر لگی ہو؟“

آپ نے غور کیا کہ اس واقعہ میں کسی نصیحت کی گنجائش ہی نہیں۔

میرے باپ کی زندگی کا صرف یہی ایک واقعہ ایسا تھا جس میں اُن کی کمزوری دکھائی دیتی تھی۔ وہ خود کِس قدر ڈرپوک تھے اور ہمیں ہمیشہ بہادر بننے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ بچّوں کے دماغوں کے لیے اس قسم کے واقعات، سچائی، تمیز اور دوسری نصیحتوں سے بھری ہوئی مثالی کہانیوں سے کہیں زیادہ اثر ڈالتے ہیں۔

روزاِس قسم کے واقعات سے ہمیں سچائی کا پتہ چلتا تھااور ہماری سمجھ میں یہ بات آ جاتی تھی کہ ہمارے بزرگ بھی کبھی ہماری طرح بچّے تھے۔ ورنہ دوسری طرح کی کہانیوں میں تو وہ بچّوں کی بجائے ہمیں بوڑھے ہی نظر آتے تھے۔ جیسے پیٹ تک لمبی داڑھی بچپن ہی سے اُن کی ٹھوڑی سے لگی ہوئی تھی۔

شرارت بھی ایک طرح کی زندگی ہے، جس سے بچّے بڑھتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ قدرتی چیزیں بچّے کو ورثے میں دے کر اسے بڑھاتی ہے۔

ہم عام طور پر دیکھتے ہیں کہ عقل، نصیحت اور سچائی کے پیدا ہونے کے بعد جسمانی اور روحانی نشو و نما رُک جاتی ہے۔ بچّے کو عقل اور نصیحت کی ضرورت ضرور ہوتی

ہے مگر اُسے آہستہ آہستہ اور غیر محسوس طریقے پر آنا چاہیے نہ کہ اسے اس پر زبردستی ٹھونسنا چاہیے۔

بچّے کی زندگی میں سلائی کی مشین کی ہتھّی گھمانا، بغیر اجازت ندی میں نہانا، عشق پیچاں کی بیل کو جڑ سے کاٹ دینا اور اسی طرح کی سیکڑوں چیزیں آتی ہیں، جن سے اُسے منع کر دیا جاتا ہے، اس کی فطری جستجو کے مادہ کو دبایا جاتا ہے، لیکن کیا وہ دب جاتا ہے؟ اور اگر وہ دب بھی جائے تو کیا اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکلتا ہے؟

سردیوں کی ایک صُبح کو کسی بچّے نے ایک گھوڑے کو اس کے تھان سے کھول دیا۔ بابا اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے ٹیڑھے میڑھے اور اُونچے نیچے کھیتوں میں بھاگ رہے تھے۔ اُن کی ڈاڑھی اُڑ رہی تھی۔ ان کی سُرخ اور نوکیلی ناک سے پانی بہہ رہا تھا، اور اس سے پہلے ہم سب آٹے کی چڑیاں بنانے کے جُرم میں پِٹ چکے تھے۔

آخر کار ہماری روز روز کی شرارتوں سے تنگ آکر اور ہماری عادتوں کو سنوارنے کے لیے بزرگوں نے ہمارے لیے ایک ماسٹر مقرر کر دیا جو ہمیں چھوڑ کر باقی سب کی عزّت کرتا تھا۔ ہمارے اس ماسٹر نے ایک نئی ہی چیز ایجاد کر دی۔ وہ یہ

کہ ہم میں سے جو لڑکا زیادہ سعادت مند ہوتا، اس کو با ادب با تمیز ہونے کے سلسلہ میں ایک سُرخ رنگ کا نشان دے دیا جاتا۔ اس "نئے پن" کا ہم پر بہت اچھا اثر ہوا۔ مگر سچّی بات تو یہ ہے کہ اس امتیازی نشان نے ہماری ذہانت کو اسی طرح غلام بنا دیا تھا، جس طرح انگریز حکمران ہمارے کسی قومی بھائی کو "دیوان بہادر" یا "خان بہادر" بنا کر اس کے ہاتھ پاؤں کی آزادی چھین لیتے تھے۔ اس طرح کے عزّت یافتہ لڑکے کو ہم بہت للچائی اور افسوس بھری نظروں سے دیکھا کرتے تھے، اور اکثر "با ادب با تمیز" کے لفظوں میں سے "ادب" اور "تمیز" نکال کر بکری کے بچّے کی طرح "با۔۔۔۔ با" ممیانے لگتے۔ حالانکہ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ ہماری اس حرکت میں انگور کھٹّے والا جذبہ بہت ہوتا تھا اور سچائی اور آزادی کی کھوج والا جذبہ بہت کم ہوتا تھا۔

بہار کے موسمی حُسن نے اپنی کشش چھوڑ دی تھی اور اس کے میٹھے پن میں کڑواہٹ آ گئی تھی۔

یہ وہ دِن تھے جب شہتوت کے درختوں میں کونپلیں پھوٹ رہی ہوتی ہیں اور ان میں سے نکلے ہوئے پھول راہ چلتے لوگوں کی نظروں کو للچا کر دیکھنے پر ایک بار تو

ضرور مجبور کر دیتے ہیں اور لوگ چلتے چلتے رُک جاتے ہیں۔ چنار کے خوب صورت اور چوڑے پیڑ اپنی گھنی چھاؤں میں ایک ماں کی گود کی طرح راحت اور سکون بخش رہے تھے۔ اُن کی لمبی لمبی ٹُریوں اور ان کے گرد کے پھُول پتّوں میں پگمنٹ اور کلوروفین کا روپ دکھائی دے رہا تھا۔

ایسی ہی ایک شام میں میرے ساتھ بھی ایک واقعہ پیش آیا۔ مجھے بھی سعادت مندی کا وہ سُرخ نشان دے دیا گیا۔ اس وقت مجھے اپنے ساتھیوں کا ممیانا اور مجھ پر ایک طرح غدّاری کا الزام دینا بہت بُرا لگا۔

اسی بہار اور گرمی کے درمیانے موسم میں ایک دِن میں پرتھوی بل کی چھت پر چڑھ گیا۔ وہاں ایک چھجّا سا تھا جس کے ایک کونے پر کھڑے ہو کر دیکھنے سے سامنے کا سرسبز ٹیلہ اور اس کے پاؤں میں بہتی ندی کا کلیلیں کرتا ہوا جھاگ نظر آتا تھا۔ صرف سر پر لٹکتی ہوئی لمبی لمبی ٹُریوں اور بیے کے گھونسلے کو تھوڑا سا ہٹانا پڑتا تھا۔ چھجّے پر سے مجھے وہ خار دار تار صاف دکھائی دیا تھا جس سے باہر "باادب اور باتمیز" لڑکے نہیں جا سکتے تھے۔ وہ سرمئی رنگ کا خار دار تار سبز رنگ کے کھمبوں سے لٹکتا ہوا پرتھوی بل کے بڑے پھاٹک تک جا پہنچتا تھا اور اس پر چھوٹی

چھوٹی، کالی کالی گلگلیں اپنا وزن ٹھیک کرتی نظر آتی تھیں۔ وہ سبز کھمبے دُور سے خوب صورت وردیوں میں ملبوس سپاہی نظر آتے تھے اور وہ تار ہمارا اخلاقی قید خانہ تھا۔ ہمارے بزرگ نہیں جانتے تھے کہ وہ تار ہمارے لیے قید خانہ نہیں بن سکتے تھے۔

انسان بغیر کسی تار اور بغیر کسی حد کے بھی قید سے بچا رہ سکتا ہے۔ اسے آزادی کی ضرورت ہے۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے میرے تمام ساتھی وہاں آئے اور اپنے کپڑے اُتار کر پانی میں داخل ہو گئے۔ ننگ دھڑنگ کیسی آزادی تھی، جس میں سوچنے کی بھی مہلت نہیں تھی۔ چھوٹا سا خیال اور ایک معمولی سی سوچ بھی ایک تباہ کُن تہذیب بن سکتی تھی۔

ایک بچّے نے لکڑی کی ایک بڑی سی بِلّی کو پانی میں بہایا اور خود اُس کے اوپر منہ کے بَل لیٹ گیا، اور اب اس کے ہاتھ پاؤں چپوؤں کا کام دینے لگے۔

میرا تصوّر چمک اُٹھا۔

کنارے پر شانتی اور سوماں، مٹّی اور دھول میں کھیل رہی تھیں۔ ان کو مٹّی میں کھیلنے سے منع کیا جاتا تھا مگر وہ سمجھتی تھیں کہ مٹّی سے اُن کا کیا رشتہ ہے۔ وہ رشتہ جو ماں، باپ، بہن اور بھائی کے رشتے سے بھی زیادہ مضبوط اور گہرا ہے۔ کہیں زیادہ گہرا اور اٹوٹ ہے۔

اس دِن میں نے بابا کو بتایا کہ آج سب لڑکے بغیر اجازت کے ندی پر نہانے کے لیے گئے ہوئے تھے، اور پھر تمام لڑکوں اور لڑکیوں کی خوب پٹائی ہوئی۔ انسان کی فطرت آزادی کو کس قدر ترستی ہے، ملک کی آزادی، روحانی آزادی۔ اس کا اندازہ کوئی با اخلاق غلام نہیں کر سکتا۔ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ اسے روٹی کپڑے کی لعنت سے بھی آزاد کر دیا جائے۔

پرتھوی بل نے مجھے عقل مند اور با اخلاق بنا دیا۔ میرے بزرگ مجھ سے بہت ہی خوش تھے کہ میں دوسرے بچّوں کی طرح گستاخ نہیں ہوں۔

مجھے اکثر معدے کی شکایت رہتی تھی، جو بچّے مویشیوں کی طرح بے تحاشا چرتے رہتے تھے، وہ تندرست رہتے تھے۔ لیکن میں جو کھانے میں بھی بہت احتیاط برتتا تھا، اس کے باوجود میں ہمیشہ بیمار رہتا تھا۔

بیٹھک میں صندل کی صندوقچی کے پاس ایک قلم دان تھا اور اس پر کچھ پیسے پڑے ہوئے تھے۔ میں لیمپ جلا کر اس کی مدّھم روشنی میں کتاب پڑھ رہا تھا۔ مگر میرا دل، میری سوچ شہتوت اور چنار کے پتّوں کو پھلانگتی ہوئی ہوا کی سیٹیوں کی طرف تھی اور میری زبان لمبے لمبے شہتوتوں کا ذائقہ لے رہی تھی۔ اور میرے ہاتھ پاؤں خیالوں کی ندی کے پانی میں چپوؤں کی طرح ہل رہے تھے۔

میں اچانک اپنی کتاب بند کر کے اُٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی کے پاس جا کر ایک ترئی اور بیے کے گھونسلے کو ایک طرف ہٹا دیا۔

مجھے یہ احساس پیدا ہوا کہ انسان کا زمین اور آسمان کی وسعت سے بھی ایک رشتہ ہے۔

پرتھوی بل سے باہر روز کی طرح آج بھی دتا کراؤندے اور سنگھاڑے بیچ رہا تھا۔ گاؤں کے بہت سے بچّے اس کے پاس کھڑے خوب شور مچارہے تھے۔

میں نے میز کے پاس کھڑے ہو کر اپنے جسم پر لگے ہوئے سعادت مندی کے سُرخ نشان کی طرف دیکھا اور پھر میں اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے قلم دان کی

طرف بڑھا اور وہاں پڑے ہوئے پیسے اُٹھا لیے اور سُرخ نشان پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

اب مَیں قید خانے سے باہر آ گیا تھا۔

ندی کے کنارے دُور تک ایک قطار میں کھڑے وہ سبز رنگ کے خاموش سپاہی مجھے دیکھ کر مُسکرا رہے تھے۔ میری اس جرأت اور ہمّت کی داد دے رہے تھے۔ میرا دل کھلے آسمان کی طرح کھیل رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے سے سردی سی لگنے لگی۔

شام کو مجھے بہت تیز بخار ہو گیا۔ میرا جسم اور میرا دل قدرت کے رحم کے قابل نہیں رہا تھا۔ میرا ضمیر مجھے مسلسل ملامت کر رہا تھا۔ میری نبض تیز ہو گئی۔ شام کو بابا آئے۔ مجھے ان کا منہ ٹیڑھا، ترچھا نظر آ رہا تھا۔ پھر رنگ برنگے نقطے سے میری آنکھوں کے سامنے پھیلنا شروع ہو گئے۔ مگر ان لفظوں کے پھیلنے ہوئے دائروں میں سے مجھے بابا کی دودھ ایسی داڑھی اسی طرح ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔

میں نے بابا کو بتایا کہ امّی نے مجھے چوری کے جرم میں بہت مارا ہے۔ حالانکہ میں

نے چوری نہیں کی تھی۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ بابا نے بھی ایک بار چوری کی تھی لیکن اُنہوں نے دادی کے سامنے اپنی چوری تسلیم کر لی تھی۔ اس روز ماں نے جب مجھ سے پیسوں کے متعلّق پوچھا تو میں انجان بن گیا تھا۔ کاش میں بھی اپنے بابا کی طرح باہمّت ہوتا اور اپنے جرم کو مان لیتا۔ میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اور بابا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

”بابا، کہانی سنایئے؟“

”کون سی کہانی بیٹے؟“ اُنہوں نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”جب آپ بچّہ تھے۔ آپ نے ایک بار چوری کی تھی۔ آپ نے امّی کے سامنے یہ چوری مان لی تھی۔ اس وقت آپ بہت چھوٹے سے تھے نا؟“

ختم شد